اقبال کے جمالیاتی افکار

نصیر احمد ناصر

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال (۱۸۷۳—۱۹۳۸) شاعر، فلسفی اور عالم جمالیات ہیں ۔ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ۔ اور انہوں نے لاہور میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔

اقبال کے جمالیاتی تصورات پر بحث کرنے سے پہلے اس امر کی صراحت ضروری ہے ۔ کہ انہوں نے جمالیات پر جو کچھ کہا ہے ۔ صرف شعر میں ہی کہا ہے۔ لہذا ان کے افکار میں اس منطقی نظم و ضبط اور ربط و تسلسل کی توقع نہیں کی جا سکتی جو نثری تحریرات میں پائے جاتے ہیں ۔ لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ ان کے نظام فکر میں سرے سے وحدت ہی کا فقدان ہے ۔ ان کے فکر میں یقیناً منطقی تسلسل اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ جو بادی النظر میں محض اس لئے نظر نہیں آتی ۔ کہ ان کے افکار مختلف شعری صورتوں میں علیحدہ علیحدہ مقامات پر بکھرے پڑے ہیں ۔ چنانچہ اگر ان کے متعلقہ اشعار کو ان کے ارتقائی فکری تسلسل کے ساتھ یکجا کر کے دیکھا جائے تو ان میں منطقی نظم و ضبط اور ربط و تسلسل صاف وحدت کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے ۔ لہذا ناقد ہو یا مؤرخ جمالیات، اسے اقبال کے جمالیاتی نظریات کا جائزہ لینے اور ان پر نقد و نظر کا دروازہ کھولنے سے پیشتر ان کے افکار کو مختلف مقامات سے اکھٹا کر کے ایک ارتقائی فکری تسلسل میں یکجا کر لینا از بس ضروری ہے ۔ ورنہ اس کا جائزہ یا محاکمہ معتبر نہ ہوگا۔

ہر فلسفی اور مفکر کی طرح اقبال کے نظام فکر کا بھی ایک مرکزی نقطہ ہے، اور وہ ہے ''خودی،، ۔ خودی کیا ہے؟ اقبال نے اس کے صفات اور اہمیت پر بہت کچھ لکھا ہے اور بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے ۔ لیکن جہاں تک خودی کی ماہیت کا تعلق ہے اس نے صرف اس قدر ہی کہا ہے ۔ کہ وہ ایک ''نقطۂ نور،، ہے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ''نور،، جو ہمارے جسم میں ہماری زندگی و حرکت کا مبداء ہے، خود کیا ہے؟ اقبال نے براہ راست تو اس کا جواب نہیں دیا۔ البتہ نور کی ایک ایسی صفت بیان کر دی ہے جو اس کی ماہئیت کی طرف نشاندہی ضرور کرتی ہے—

درون سینہ آدم چہ نور است
چہ نور است اینکہ غیب او حضور است

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی عجیب شے ہے جو ہمارے سینے میں موجود ہونے کے باوجود ہم سے مخفی بھی ہے۔ اور ساتھ ہی ہم پر ظاہر بھی ہے یعنی وہ ہمارے حواس سے پوشیدہ تو ہے لیکن ہمارے وجدان و شعور سے پنہاں نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا اخفا ہی اسکی ہستی کے شعور کا ذمہ دار ہے۔ بنظر غائر دیکھیں۔ تو اس شعر میں اقبال نے قرآن حکیم کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس میں حقیقت انسانی کے اس پہلو کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ کہ انسان میں حسیاتی۔ وجدانی۔ اور ذہنی تعقل و شعور اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی روح اس میں پھونک دیتا ہے—

و نفخت من روحی وجعل لکم سمع والبصر و الافئدۃ (اے انسان! تم میں جب میں نے اپنی روح پھونک دی، تب تمہارے لئے سامعہ و باصرہ (یعنی حواس) اور قلب (یعنی دل و دماغ) کی قوتیں بنا دیں)—

اقبال نے اس رعایت معنوی سے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (اللہ نورالسموات والارض) لہذا اس کی روح بھی نور ہوگی، روح انسانی کو اسکی محدودیت کی بناء پر نقطہ' نور اور خدا کی رعایت لفظی سے اس کو خودی کے نام سے موسوم کر دیا۔ اپنے اس ذہنی پس منظر کی بناء پر اقبال خودی کو خدا کے اسم تصغیر کے طور پر ہی استعمال کرتا ہے۔ لیکن ہمہ اوست کے مسلک کے داعیوں کی طرح اسے خدا نہیں سمجھتا۔ بلکہ وہ خودی کو اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہی تصور کرتا ہے۔ مخلوق جو اس عالم صوری میں ''معنی دیریاب،، بھی ہے۔ اور خدائی صفات سے اضافی طور پر متصف ہونے کی بناء پر خود ذات میں ایک لا محدود عالم ممکنات بھی ہے۔ اس امر کی مجملاً توضیح یہ ہے کہ خودی اگرچہ اس ذات مطلق کی جزو ہے۔ جو منفرد و یکتا اور علیم و خبیر ہے لیکن جب مطلقیت کی لا محدودیت لا فانیت اور لا مکانیت و لا زمانیت سے جدا ہوکر زمان و مکان کی

محدودیت و فانیت کے اندر ایک بڑی ہی ناچیز تنگناء کے اندر جسے قفس عنصری یا جسم انسانی کہتے ہیں، مقید کر دی جاتی ہے۔ تو اپنے صفات سے کلیتاً محروم تو نہیں ہو جاتی، البتہ ان صفات میں محدودیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس محدودیت میں لا محدودیت کے امکانات بھی موجود ہوتے ہیں جنکو بروئے کار لانا ہی فطرت کا منشاء، حیات انسانی کا مقصود اور انسان کی عبادت ہے۔ اور یہی فلسفہ حیات کا خلاصہ یا جوہر ہے۔ بہر کیف خودی کو قفس عنصری میں بھی اپنا شعور رہتا ہے اور اس کا یہی شعور ذاتی ہے۔ جو ہر فرد کو انفرادی حیثیت بخشتا ہے۔

روح مطلق کا چونکہ یہ خاصہ ہے کہ وہ ہر لحظہ مظاہر کائنات میں اپنی گوناگون شان ارتقائی کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی رہے لہذا روح انسانی یا خودی بھی اپنی اصل کی طرح ہر دم اپنے عالم ممکنات میں ایک حرکت مسلسل اور نت نئی شان میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ اس کا مسلسل شان تغیر میں ظاہر ہونا روح مطلق کی طرح محض اضافی حیثیت میں ہوتا ہے۔ ورنہ اپنی مطلق حیثیت میں وہ روح مطلق کی طرح ہر رنگ تغیر سے ناآشنا ہے۔

من او را ثابت و سیار دیدم
من او را نور دیدم نار دیدم

یہ نور جس طرح اپنی موضوعی صورت میں زندگی و حرکت کا سر چشمہ ہے۔ اسی طرح اپنی معروضی صورت میں حسن و سرور کا مبداء بھی ہے۔ لیکن اس خودی میں مادی عناصر میں مقید ہوجانے کے سبب اس نور کی ایک متضاد صفت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو نار ہے۔ اور یہ نار اپنی معروضی صورت میں جمود و تعطل اور موضوعی صورت میں قبح و حزن کا منبع ہے۔ چنانچہ اسی لئے اقبال نے خودی کو نور بھی کہا ہے اور نار بھی۔

خودی کا ظہور و خفاء ہی فلسفے کی زبان میں معروضیت و موضوعیت کہلاتا ہے۔ معروضیت موجودات کا ظہور اور موضوعیت زندگی کی حرکی قوتوں کا مخفی سر چشمہ ہے۔

خودی کیا ہے؟ راز درون حیات
خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات

یہ تصور خودی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اقبال زندگی کے موضوعی یا تنزیہی پہلو اور اسکے معروضی یا صوری پہلو دونوں کا قائل ہے۔ اپنے اس تصور کی بنا پر وہ حسن کی معروضی و موضوعی دونوں حیثیتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ اس شعر سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے۔ کہ اقبال حسن کی پیدائی کے لئے ''اظہار،، کو ضروری سمجھتا ہے۔

خودی جب تک معرض اظہار میں نہیں آتی وہ زندگی کا محض ایک موضوعی راز ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنا اظہار کر دیتی ہے۔ تو کائنات کی بیداری یا حسن بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال اس جمالیاتی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ جو نظریہ' اظہاریت کا داعی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مکتب فکر کے نزدیک ''اظہار،، حسن کی ایک لازمی شرط ہے۔ اقبال کا یہ تصور حسن قرآنی ہے۔ جسے بعض جدید مغربی علمائے جمالیات نے بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے کروچے اس نظریہ' اظہاریت کا سب سے زیادہ متشدد نقیب ہے۔ پھر کیف اقبال نے اس تصور حسن کو بیان کرنے کے لئے کئی انداز اختیار کئے ہیں۔

آفریدن ؟ جستجوئے دلبرے
وا نمودن خویش را بر دیگرے

اس شعر میں اس نے اس اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ کہ فنی تخلیق کا اصل محرک جذبہ' محبت ہوتا ہے۔ یہ محبت فنکار کو اس شے سے ہوتی ہے۔ جو اسکے تصور میں حسین ترین ہوتی ہے۔ لہذا وہ اسکی محبوب و دلبر ہوتی ہے۔ اور اس پیکر حسن و محبت کی تلاش میں وہ عالم فن میں آ نکلتا ہے۔ جہاں جذبہ' محبت اسے اپنے محبوب کو عالم تصور سے عالم محسوس میں لانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس اعتبار سے فنکار کا اپنے حسین ترین تصور کو محسوس صورت میں لانے اور ظاہر کر دینے کا نام تخلیقی فعلیت ہوا۔ یہ تخلیقی فعلیت در اصل خودی کا اظہار ذاتی ہوتا ہے۔ اور اس میں ہی اس کی بقا اور ترقی و استحکام کا راز مضمر ہے۔

بے ذوق نمود، زندگی موت   تعمیر خودی میں ہے خدائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں   باقی ہے نمود سیمیائی

کیا اقبال کے نزدیک واقعی کائنات محض نمود سیمیائی ہے؟ کیا وہ واقعی اسے نظر کا دھوکہ سمجھتا ہے؟ اقبال جیسے وحی و تنزیل کی روشنی میں حیات و

کائنات کا مطالعہ کرنے والے مفکر سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی ۔ کہ وہ ہندوؤں کی طرح اس کائنات کو مایا اور تصوریت پسندوں کی طرح اسے فریب نظر سمجھتا ہو ۔ جبکہ قرآن حکیم صاف الفاظ میں اس نظریے کا بطلان کرتا ہے ۔ اور علی الاعلان کہتا ہے ۔ کہ یہ کائنات اسکی تخلیق ہے ۔ جو نہ تو کھیل تماشہ ہے اور نہ باطل ہے ۔ بلکہ یہ ''تخلیق بالحق'' ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال بھی کائنات کو تخلیق بالحق ہی مانتا ہے ۔ اور اس نے محض مادیت پسندوں کے اس مسلک کا بطلان کرنے کے لئے کہ یہ مادہ ازلی ، ابدی اور قائم بالذات ہے ۔ اسے نمود سیمیائی کہہ دیا ۔ چنانچہ اپنے اگلے ہی شعر میں وہ اپنے اس تصور کی وضاحت کر دیتا ہے ۔ کہ کائنات اس بنا پر نمود سیمیائی ہے ۔ کہ وہ قائم بالذات نہیں ۔ لیکن وہ چونکہ قائم بخودی ہے ۔ اور خودی حق ہے ۔ اس لئے وہ تخلیق بالحق ہے ۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالم پندار کرد
صد جہان پوشیدہ اندر ذات او — غیر او پیداست از اثبات او

ان اشعار میں اقبال نے اپنے مسلک اظہاریت کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے ۔ ذرا غور سے دیکھیں ۔ تو اقبال نظریہ اظہاریت میں منقدمین سے صاف آگے نظر آتا ہے ۔ کیونکہ وہ ''اظہار'' ہی کو عین حیات سمجھتا ہے ۔

نہ کر ذکر فراق آشنائی
کہ اصل زندگی ہے خود نمائی

کروچے نے حسن آفرینی کے لئے اظہار کے ساتھ تکمیل و اتمام کی شرط بھی لگائی ہے ۔ یعنی اظہار مکمل ہونا چاہئے ۔ لیکن اقبال نے حسن آفرینی کے لئے اظہار کو خودی کی قوت کے ساتھ مشروط کیا ہے ۔ یعنی خودی کا اظہار جتنا پر زور ہوگا، معروض اسی نسبت سے حسین ہوگا۔

وا نمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است
چوں حیات عالم از زور خودی است
پس بقدر استواری زندگی است

اقبال، قوت و رفعت کو اصل کے اعتبار سے ایک ہی شے خیال کرتا ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک اس خودی کا اظہار حسین ہوتا ہے جس کا مقام بلند ہو۔ اس کے علی الرغم جس خودی کا مقام پست ہوگا اس کا اظہار بھی قبیح ہوگا۔

جہان خودی کا بھی ہے صاحب فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

اس سلسلہ تصور کا ایک متنازع فیہ مسئلہ یہ ہے کہ حسن، معروضات کی اپنی خلقی صفت اور ذاتی جوہر ہے یا نہیں؟ ''وحدت حسن وجود،، کے نظریے کی رو سے حسن، معروضات کا ذاتی جوہر یا صفت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کوئی حسین معروض بھی، حسن کے اعتبار سے قائم بالذات نہیں ہو سکتا۔ اس مقدمے کی بنا پر کہ تمام معروضات حسن مطلق کی بدولت ہی حسین نظر آتے ہیں، افلاطونس کے مکتب فکر میں حسن کو مستعار، اضافی اور فانی کہا گیا ہے۔ اقبال بھی اپنے ابتدائی کلام میں مجازی حسن کے فانی ہونے سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہو جسکی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمین کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہوگیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار چلا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار چلا

قرآن حکیم کا جمالیاتی مسلک یہ ہے۔ کہ کائنات کی ہر شے حسین ہے۔ اور وہ اشیاء بھی جو اپنی اضافی یا منفی حیثیت یا کسی اور سبب سے بظاہر قبیح نظر آتی ہیں، حقیقت میں حسین ہیں۔ اس قرآنی جمالیاتی نظریے کو آگستائین بھی حکیمانہ انداز میں پیش کر چکا ہے۔ اقبال بھی اس نظریے کا حامل ہے اور اس نے اس نظریے کو اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے۔

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایاں حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن
حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے
مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت، شفق کی گلفروشی میں ہے یہ
عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلک نا آشنا کی کوشش گفتار میں
ساکنان صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمہ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے
زندگی اس کی مثال ماہیء بے آب ہے

مندرجہ بالا اشعار کی رو سے اقبال کے نظریہ حسن کا معروضی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ حسن کے معروضی یا خارجی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے متعدد مقامات پر اس امر کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً

قلب و نظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود، ایک نگہ کا زیاں

اقبال جس طرح حسن کی معروضیت کا قائل ہے اسی طرح وہ حسن کی موضوعیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ یہ تضاد فکر نہیں، بلکہ ایک خاص انداز فکر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ عام طور پر حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو نہ تو بیک وقت بیان کرتا ہے اور نہ ہی اس اعتبار سے اس کے بیان میں کوئی منطقی تسلسل ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ان کو جستہ جستہ معرض اظہار میں لاتا ہے۔ جہاں تک حسن کی موضوعیت کا تعلق ہے اس سے بھی وہ بہت زیادہ متاثر اور اس کا قائل

نظر آتا ھے ۔ البتہ حسن کے موضوعی پہلو کے بیان میں شاید اس لئے کہ وہ اس سے نسبتاً زیادہ متاثر ھے بعض اوقات ایسا پیرایہ اختیار کر لیتا ھے ۔ جس سے شبہ ہونے لگتا ھے ۔ کہ وہ حسن کی معروضیت کی نفی کر رہا ھے ۔ حالانکہ جیسا کہ بعد میں ثابت کیا جائیگا وہ حسن کی معروضیت و موضوعیت دونوں ھی کا قائل ھے ۔ اب چند ایسے اشعار پیش کئے جاتے ھیں ۔ جو اس کے موضوعی نظریہ٭ حسن پر روشنی ڈالتے ھیں۔

این جہان‌چیست؟ صنم‌خانه٭ پندار من است   جلوۂ او گرد دیدۂ بیدار من است
همه آفاق که گیرم بنگاهے او را   حلقه٭ هست که از گردش پرکار من است
هستی و نیستی از دیدن و نا دیدن من   چه زمان وچه مکان شوخی٭ افکار من است

ان اشعار کی روشنی میں ہم اقبال کے تصورات موضوعیت کی تدوین کچھ اس طرح کر سکتے ھیں ۔ اول، یہ جہان انسان کے اپنے تصورات کی محبوب دنیا کے سوا کچھ نہیں ۔ دوئم، یہ کہ اس دنیا کی جلوہ افروزی نظر انسان ھی کی مرہون منت ھے ۔ بالفاظ دیگر اگر انسان میں نظر اور نظر میں صلاحیت دید نہ ھو، تو یہ دنیا جلوہ نما ھی نہیں ھوسکتی ۔ سوئم، یہ کہ وجود و عدم یا ھست و نابود، اصل میں دید و نادید کا نام ھے ۔ دیکھئے تو سب کچھ، نہ دیکھئے تو کچھ بھی نہیں ۔ اور وہ شے جسے زمان و مکان کہا جاتا ھے ۔ محض ھماری شوخی٭ افکار کی تخلیق ھے ۔ الغرض اقبال کے نزدیک انسان کی ذھنی فعلیت کی بدولت ھی زمان و مکان کا یہ سلسلہ معرض شہود میں آتا ھے ۔ کانٹ، ھیگل اور شیلنگ بھی قریب قریب اسی نظریہ کے حامل تھے بعض اوقات تو اقبال اپنے زور تخیل میں موضوعیت پسند حکمائے جمالیات سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ھوا نظر آتا ھے۔

سینہ٭ شاعر تجلی زار حسن   خیزد از مینائے او انوار حسن
از نگاھش خوب گردد خوبتر   فطرت از افسون او محبوب تر

فرائڈ نے بھی اسی نظریہ٭ موضوعیت پر اپنے مشہور نظریہ٭ جنسیت کی بنیاد رکھی ھے ۔ جسکی رو سے جنسی جذبے یا خواھش ھی پر حسن و قبح کا انحصار ھوتا ھے ۔ لہذا اس دنیا میں کوئی شے نہ تو خوبصورت ھے اور نہ بد صورت۔ یہ جنسی جذبہ ھے جو معروض شہودہ میں حسن پیدا کر دیتا ھے ۔ اس نے اس طرح سرے سے حسن کی ھستی ھی کا انکار کردیا ۔ اقبال اس منکر حسن کے نظریہ٭ جنسیت کو اس بنا پر غلط سمجھتا ھے ۔ کہ آرزو خلاق حسن نہیں، بلکہ

حسن خلاق آرزو ہے۔

حسن خلاق بہار آرزوست — جلوہ اش پروردگار آرزوست
ہر چہ باشد خوب وزیبا و جمیل — در بیابان طلب مارا دلیل
نقش او محکم نشیند در دلت — آرزو ہا آفریند در دلت

یہ مباحث اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ اقبال کی نظر حسن کے معروضی اور موضوعی دونوں پہلوؤں پر تھی، لیکن یہ اور بات ہے کہ اس نے حسن کے ان دونوں پہلوؤں کو علیحدہ علیحدہ تسلیم کیا ہے۔ لہذا یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ وہ قرآن حکیم کے نظریہ' وحدت جمال کا حامل اور نقیب ہے۔ اور مزید دلیل کے طور پر اس کے کلام سے چند ایک ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جو اس کے اس نظریے کے آئینہ دار ہیں۔ یعنی جن میں اس نے حسن کی معروضیت و موضوعیت دونوں کو بیک وقت تسلیم کرلیا ہے۔

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایان حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہرقطرے میں ہے طوفان حسن

اس شعر سے صاف عیاں ہے کہ وہ معروضی حسن کے ساتھ موضوعی حسن کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے حسن معروضی کی ہستی یا شہود کو آنکھ کے دیکھنے کے عمل سے وابسطہ و مشروط کر دیا ہے۔ اس نے اپنے اس تصور وحدت جمال کو جاوید نامہ میں ایک جگہ زیادہ واضح صورت میں پیش کیا ہے۔

کلک حق از نقشہائے خوب و زشت — ہر چہ مارا سازگار آمد نوشت
چیست بودن دانی اے مرد نجیب؟ — از جمال ذات حق بردن نصیب
ایں ہمہ ہنگامہ ہائے ہست و بود — بے جمال ما نیامد در وجود

یہ ''جمال ما،، ہی تو ہے جو ظہور حسن کی شرط ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ خالق حقیقی نے کائنات کو خوب و زشت کے نقوش سے مزین بھی کیا ہوا ہے۔ فطرت کا ہر وہ نقش جسے ہم بعض اوقات غلطی سے قبیح خیال کر لیتے ہیں، چونکہ مشیت ایزدی میں ہمارے لئے سود مند و موزوں ہے، اس لئے حقیقت میں وہ قبیح نہیں، بلکہ حسین ہے۔ چنانچہ اس معروضی حسن کو دیکھنے کے لئے جس طرح نظر یا حواس کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح قلب یا شعور کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں حواس و قلب کی ضرورت اور باہمی تعلق پر تو بحث

آئندہ کی جائے گی ۔ فی الحال اس طرف اشارہ کردینا کافی ہے ۔ کہ قوتیں حواس کی ہوں یا قلب کی یہ ''جمال ما،، یا ہمارے موضوعی نور ہی کا اعجاز ہیں اورہم ان کے طفیل ہی معروضی حسن کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

حیات هر نفس بحر روانے ‏ ‏ شعور و آگهی او را کرانے
گذشت از بحر و صحرا رانمی داد ‏ ‏ نگه را لذت کیف و کمے داد
هر آن چیزے که آید درحضورش ‏ ‏ منور گردد از فیض شعورش
بخلوت‌مست وصحبت نا پذیر است ‏ ‏ ولے هر شے ز نورش مستنیر است
شعورش با جهان نزدیک ترکرد ‏ ‏ جهان او را ز راز او خبر کرد

اب اس کے اردو کلام سے بھی کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں، جو اس کے نظریہ وحدت جمال کے مظہر ہیں—

بہار و قافلہ لالہ ہائے صحرائی ‏ ‏ شباب ومستی و ذوق و سرور ورعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروںکی ‏ ‏ یہ بحر! یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمرکا عماری شب میں ‏ ‏ طلوع مہر و سکون سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

آخر میں اقبال کا ایک ایسا شعر پیش کیا جاتا ہے ۔ جو ان تمام مباحث میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس شعر میں اس نے اس واقعیت کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ تن و جان یا دوسرے لفظوں میں معروضیت و موضوعیت میں وحدت پائی جاتی ہے ۔ اس لئے ان کو بصورت وحدت ہی دیکھنا چاہئے ۔ لہذا حقیقت کے ان دونوں رخوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کرکے دیکھنا ناجائز ہے۔

تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا دیدن حرام است

ان تمام مباحث سے ثابت یہ ہوا کہ اقبال کا نظریہ حسن معروضیت۔ موضوعیت کا ہے ۔ جسے ہم معنوی مناسبت کی بنا پر وحدت جمال کے نام سے موسوم کر چکے ہیں ۔ اور یہی نظریہ اپنی جگہ پر صحیح اور جامع بھی ہے—

ہم پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم ہی نے سب سے پہلے انسان کو واضح طور پر اس جمالیاتی واقعیت سے آشنا کیا ہے ۔ کہ حسن جامد نہیں بلکہ

حرکی ارتقائی ہے۔ چنانچہ اقبال بھی اسی نظریے کا حامل اور مبلغ ہے۔ اور اس نے اسے مختلف دلچسپ اسالیب میں بیان کیا ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

ایک صورت پر نہیں رہتے کو قرار
ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

کائنات کے تغیر دوام میں سکون و ثبات کا نظر آنا تو فقط ایک فریب نظر ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودات کا ذرہ ذرہ ہر دم ایک نئی شان یا حسین حالت ارتقائی میں رہتا ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات   تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود   کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

جب صورت حال یہ ہے تو پھر زمان و مکان کا تعین بھی بے سود ہے اور قیام و ثبات لایعنی۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات، ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

حسن چونکہ ہر لحظہ ایک نئی شان میں جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے، اس لئے ذوق نظر کی تسکین بھی ہمیشہ تشنہ ہی رہتی ہے۔ اور یہی ہمارے مشاهدے اور زندگی دونوں کا حاصل ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کائنات کے ہر لحظہ متغیر و حسین نظاروں کو دیکھنے کے لئے انسان کے قلب و نظر میں بھی مساوی طور پر حسن (موضوعی) کی حرکت ارتقائی کا پایا جانا لا بدی ہے۔ ورنہ وہ حسن کے مسلسل حرکی و ارتقائی جلووں کا ساتھ کیونکر دے سکیں گے۔ لہذا مشاهدے کی تکمیل کے لئے موضوعی حسن اور معروضی حسن دونوں کی ارتقائی

حرکت میں مساوات و یکسانیت کا پایا جانا یقیناً ضروری ہوا۔

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

حسن چونکہ ہر لحظہ ایک نئی ارتقائی صورت میں جلوہ فگن ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے انسان کو بھی فطری طور پر ''حسین سے حسین تر،، کی طلب و جستجو لگی رہتی ہے۔

چو نظر قرار گیرد بہ نگارے خوب روئے — تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جوئم ز ستارہ آفتابے — سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم — غزلے دگر سرائم بہ ہوائے نو بہارے
طلبم نہایتے من کہ نہایتے ندارد — بہ نگاہے نا شکیبے بہ دل امیدوارے

ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگارے است ولے خوشتر ازاں می باید

نہ صرف انسان کو بلکہ خود فطرت کو بھی ''خوب تر،، کی آرزو و تمنا برنگ دوام رہتی ہے۔

فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوبتر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو!

جلال و جمال، حسن کی دو صفات ہیں ۔ جلال، قوت و جبروت، قہاری و جباری کا، جمال رحمت و لطافت، معصومی و نزاکت کا مظہر ہے ۔ یہ ایک اہم اور قابل لحاظ نکتہ ہے ۔ کہ اگرچہ جمال و جلال دونوں کے مجموعے کا نام حسن ہے، لیکن اس کے باوصف جمال و جلال میں سے ہر ایک اپنی اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

---

۱ مزید تفصیل کے لئے مولف کی کتاب ''جمالیات—قرآن حکیم کی روشنی میں،، (۱۹۵۸) مطبوعہ بزم ترقی ادب لاہور ملاحظہ ہو۔ جس میں اس مسئلہ پر قرآن حکیم کی روشنی میں بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

یعنی ایک شے صرف جمیل رہتے ہوئے بھی حسین ہو سکتی ہے۔ اور یہ لازم نہیں کہ وہ جلیل بھی ہو۔ مثلاً پھول، چڑیا، ہرن، چاند، ستارہ، صنف نازک وغیرہ۔ اب اس طرح ایک جلیل شے جمال کی صفت سے محروم ہونے کے باوجود حسین ہو سکتی ہے۔ مثلاً شیر، پہاڑ، سمندر، بڑی بڑی آبشاریں، سورج، وغیرہ۔

مغربی علمائے جمالیات جنہوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ جلال و جمال کا صحیح تصور قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان علماء کی اس ناکامی کا بنیادی سبب ان کا یہ مفروضہ ہے کہ جلال، حسن کی صفت نہیں، بلکہ حسن سے علیحدہ کوئی مستقل شے ہے۔ لیکن اقبال کی نظر چونکہ آخری الہامی کتاب پر تھی۔ اس لئے وہ حکمائے فرنگ کی اس اجتہادی غلطی کا شکار نہ ہو سکا۔ اس نے قرآن حکیم کے تصور جمال و جلال کی صحت و جامعیت کی بناء پر اسے قبول کیا ہے۔

خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال	کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

علم ترسان از جلال کائنات	عشق غرق اندر جمال کائنات

حسن کی یہ دونوں صفات انسان کی سیرت و کردار میں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

ہو چکا قوم کی شان جلالی کا ظہور	ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

بے تجلی نیست آدم را ثبات	جلوہ ما فرد و ملت را حیات
ہر دو از توحید میگیرد کمال	زندگی ایں را جمال آں را جلال

اقبال کے بعض شارحین اور تذکرہ نویسوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ وہ جمال کے مقابلے میں جلال کو ترجیح دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی کمزور اور درماندہ قوم کو قوت کا پیام دیا ہے۔ اور مسلمانوں کو "شاہین" بننے اور فرعونیت کے مقابلے میں "عصائے کلیمی" سے کام لینے کی تلقین کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ وہ جلال کو جمال سے بہتر سمجھتا ہے۔ جمال و جلال دونوں چونکہ حسن ہی کی صفات ہیں، اس لئے وہ دونوں ہی کی اہمیت و افادیت پر زور دیتا ہے۔

او لاالہ کے وارث! باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ

لیکن جہاں تک جلال و جمال کی تقابلی قدروں کا تعلق ہے ۔ اقبال کے نزدیک جمال واضح طور پر جلال سے بہتر ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کی اس جاذبیت و نظر افروزی کا راز بھی ہے کہ یہاں جمال ہر لحاظ سے جلال کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر جلوہ نما ہے۔

یا بزور دلبری انداختند یا بزور قاہری انداختند
زانکہ حق در دلبری پیداتراست دلبری از قاہری اولیٰ تراست

بیشتر حکمائے جمالیات کی طرح اقبال بھی جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق میں امتیاز روا نہیں رکھتا ۔ لہذا وہ بھی ذوق سے جمالیاتی حس ہی مراد لیتا ہے۔

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

یہ ذوق یا جدید اصطلاح میں جمالیاتی حس اس کے نزدیک قلب انسانی کو فطری طور پر ودیعت کی گئی ہے ۔ اور یہی مشاہدہ انسان کی حقیقی قوت ہے۔ چنانچہ یہ قوت اگر نظر یا حواس کے ہمرکاب نہ ہو۔ تو مشاہدے کا غلط یا ناقص ہو جانا بعید نہیں ۔ اس لئے اقبال مشاہدہ حسن کے لئے خصوصیت کے ساتھ حواس کی آنکھ کے بجائے دل کی آنکھ سے دیکھنے کو ضروری خیال کرتا ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

قلب، فعلی اور انفعالی قوتوں کا سر چشمہ ہے ۔ وہ فطری طور پر معصوم، مصفا اور پاکیزہ ہوتا ہے اور یہ سب حسن کی صفات ہیں ۔ جو انسان کے ذوق لطیف، پاکیزگیٔ طبع اور رفعت خیال پر دلالت کرتے ہیں ۔ قلب کی ان صفات میں جیب کوئی نقص پڑ جاتا ہے ۔ تو اس کا اثر جمالیاتی حس پر بھی پڑتا ہے ۔ جس کا نتیجہ کور ذوق اور پست خیالی کی صورت میں نکلتا ہے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

غبار راہ کو بخشا گیا ہے ذوق جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے؟

لیکن اس کے علی الرغم اگر قلب اپنی اصلی حسین حالت پر قائم رہے، یا اسکی جمالیاتی قدروں میں اضافہ ہوتا جائے۔ تو اس کی جمالیاتی حس تیز اور قوت مشاہدہ بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ان مباحث کی تنقیح کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بھی دیکھ لیں کہ آخر فن کیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں اقبال کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اگرچہ علمائے جمالیات اور ناقدین نے اس سوال کا جواب دینے کی بڑی کوشش کی ہے۔ مگر کسی ایک کے جواب کو بھی آج تک مقبولیت عام کی سند نصیب نہیں ہوئی۔ کروچے جو متاخرین میں اپنے نظریۂ اظہار کی وجہ سے ممتاز ترین مقام رکھتا ہے۔ وہ وجدان کے اظہار مکمل کو فن سے تعبیر کرتا ہے۔ فن کی ایک اور تعریف جو بعض جمالیاتی حلقوں میں مقبول ہو رہی ہے، یہ ہے کہ فن، اظہار ذاتی اور ابلاغ کی خاطر مشاہدے کی تخلیق مکرر کا نام ہے۔ اس تعریف کی رو سے فن کے تین بنیادی عناصر ہوئے۔ اول، مشاہدے کی تخلیق مکرر، دوئم، اظہار ذاتی اور سوئم، ابلاغ۔ یہ تعریف بھی نہ تو حرف آخر کا حکم رکھتی ہے اور نہ ہی نقائص سے مبرا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ نسبتاً ترقی یافتہ صورت میں پیش کی گئی ہے۔ اقبال نے بھی ابتدا میں قریب قریب ان ہی تین عناصر پر زور دیا ہے۔

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے؟
طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنج عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل! پیامی بزم قدرت کا ہوں میں
ہموطن شمشاد کا، قمری کا میں ہم راز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں
کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

شاعر کا فطرت کے قرب میں رہنا، اس کی آواز کو ہوش کے کانوں سے سننا، اور اسے شوق کی نظروں سے دیکھنا، اس لئے ہے تاکہ وہ اپنے مشاہدے کو دوسروں کے لئے معرض اظہار میں لائے۔ یہ مشاہدہ جب معروضی، موضوعی دونو عناصر پر

مشتمل ہوتا ہے۔ تو کروچے کی زبان میں وجدان اور اقبال کی اصطلاح میں فنکار کی ذات یا عین بن جاتا ہے اور اس کا اظہار ہی فن ہے۔

آفریدن ؟ جستجوئے دلبرے
وانمودن خویش را بر دیگرے

اس امر کی تصریح پہلے ہو چکی ہے۔ کہ ''جستجوئے دلبرے،، سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ فنکار کے تصور میں ایک مثالی پیکر حسن ہوتا ہے۔ جو اس کا محبوب اور مقصود نظر ہوتا ہے۔ اور جسے وہ حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ اسے اپنے عالم تصور سے محسوس دنیا میں لے آتا ہے۔ اس تصریح سے یہ دلیل قائم کی جا سکتی ہے۔ کہ فنکار فقط اس تصور ہی کی تخلیق مکرر کرتا ہے۔ جسے وہ حسین ترین یا مثالی سمجھتا ہے۔ اس طرح اقبال فن کو حسن کے ساتھ مشروط کرکے کروچے اور دیگر علمائے جمالیات پر سبقت لیجاتا ہے۔ اس نے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی جمالیاتی قدر کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

جہاں خودی کا بھی ہے صاحب فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے نا خوب
نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نا خوب

ان اشعار کی مدد سے فن کی تعریف کرنا چاہیں، تو اس طرح کر سکتے ہیں۔ ''خودی کا اپنی اور دوسروں کی خاطر اپنے حسن و کمال کے اظہار کا نام فن ہے،،۔ اقبال نے فن میں جمالیاتی عنصر کا اضافہ کرکے فن کی تعریف کو مکمل بنانے کی ا‌‌‌یک مستحسن کوشش کی ہے۔ بعض علمائے جمالیات جو فن میں جمالیاتی اقدار کے منکر ہیں، حسن کو فن کے لئے ضروری خیال نہیں کرتے، لیکن اقبال اس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ جو فن میں جمالیاتی قدروں کا ہونا ناگزیر سمجھتا ہے۔ اس نے ''بانگ درا،، میں شیکسپیر کے نام سے جو نظم لکھی ہے۔ اس میں حسن فن کے اس ناگزیر تعلق پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

حسن، آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دل انساں کو ترا حسن کلام آئینہ

جمالیات میں ایک متنازع فیہ مسئلہ یہ بھی ہے ۔ کہ تخلیقی فعلیت کے اعتبار سے فطرت بڑی ہے ۔ یا فنکار؟ یا بالالفاظ دیگر حسن و کمال کے لحاظ سے فطرت کی تخلیقات بہتر ہوتی ہیں یا فنکار کی؟ قدیم زمانے میں افلاطون اور دور جدید میں ہیگل اس نظریے کے حامی ہیں ۔ کہ فطرت، فن سے بہتر ہے ۔ اقبال اس مکتب فکر کو غلط اور فطرت کا غلام سمجھتا ہے ، اور اس کی پرزور مذمت کرتا ہے۔ وہ فن کو فطرت کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے اور فطرت کی نقالی یا تقلید کو دریوزہ گری سے تعبیر کرتا ہے۔

حسن را دریوزہ از فطرت کند
راہزن راہ تہی دستے کند

حسن جو فنکار کو مطلوب ہوتا ہے ۔ وہ فطرت کے پاس کہاں؟ اور اگر ہو بھی تو وہ انسان کو کب دیتی ہے؟ لہذا جو فنکار، فطرت سے حسن حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ وہ اس اعتبار سے رہزن ہوا ۔ اور رہزن بھی ایسا جو کنگال اور خالی ہاتھ رہگیروں پر ڈاکا ڈالتا ہے ۔ فنکار کا فطرت میں حسن کی تلاش کرنا، اس لحاظ سے بھی غلط ہے ۔ کہ فنکار جس حسن کو خارج میں ڈھونڈھنا چاہتا ہے ۔ وہ تو خود اس کے اندر موجود ہوتا ہے ۔ فطرت ایسے حسن کی حامل کہاں ہوتی ہے۔ [1]

حسن را از خود برون جستن خطاست
آنچہ می بائست پیش ما کجاست

اگر کوئی فنکار اپنے فن کو فطرت کی غلامی سے نہیں چھڑا سکتا ۔ یا اپنے آپ کو اس کا حلقہ بگوش بنا لیتا ہے ۔ تو اس کی فنی تخلیقات میں اس جوہر کا فقدان لازمی ہے ۔ جیسے بداعت[2] کہہ سکتے ہیں ۔ یہ ایک معروف واقعیت ہے ۔

---

۱ اس تصور کو بیدل اور حافظ نے بھی نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن در آ
کہ ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن در آ (بیدل)

سالہا دل طلب جام جم از ما میکرد   آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا میکرد
(حافظ)

۲ Originality

کہ ہر اچھے فن پارے پر فنکار کی ذات یا بزبان اقبال خودی کی مہر ثبت ہوتی ہے۔ جو اسے نہ صرف دوسروں کے فن پاروں سے ممیز کرتی ہے۔ بلکہ اسے ایک ممتاز انفرادی حیثیت عطا کر دیتی ہے، جس سے فطرت کے غلام فنکار کی تخلیقات کا محروم رہ جانا ناگزیر ہے۔ مزید برآں ایسی تخلیقات میں اثر و نفوذ کا بھی فقدان ہوتا ہے۔

نقشگر خود را چو با فطرت سپرد   نقش او افگند و نقش خود سترد
یک زمان او خویشتن رنگے نزد   بر زجاج ما گہے سنگے نزد

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے فن پارے میں فطرت ایک اپاھج کی طرح حرکت سے محروم اور مکروہ دکھائی دیتی ہے۔

فطرت اندر طیلسان ھفت رنگ
مانده بر قرطاس او با پائے لنگ

فطرت کی نقالی چونکہ فن کو اس انفرادیت اور دیگر اوصاف سے محروم کردیتی ہے، اس لئے فن کو فطرت کی غلامی سے آزاد کر لینا ھی اولیٰ ہے، اور اس آزادی ھی میں اس کی عظمت و بقائے دوام کا راز بھی مضمر ہے۔

اس دشت جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کئے تعمیر
اھرام کی عظمت سے نگونسار ھیں افلاک
کس ھاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر
فطرت کی غلامی سے کر آزاد ھنر کو
صیاد ھیں مردان ھنر مند کہ نخچیر

فنکار حقیقت میں نہ صرف فطرت کی غلامی سے آزاد ہے۔ بلکہ وہ سلطان ہے۔ اور فطرت خود اسکے حلقہ سلطانی کی اسیر ہے۔ لہذا اس کی فنی تخلیقات، حسن و کمال میں خود فطرت سے بڑھ کر ہونی چاھئیں۔ چنانچہ فطرت سے فوقیت لے جانے والا فنکار ھی اپنے مافی الضمیر کا مکمل اظہار کر سکتا ہے۔

آں ھنرمندے کہ بر فطرت فزود
راز خود را بر نگاہ ما کشود

ایسا آزاد فنکار اتنا وسیع القلب ہوتا ہے ۔ کہ اسے کسی قسم کے صلہ و ستائش کی خواہش و حاجت نہیں ہوتی ۔ لیکن اس کے باوجود دنیا اسے عقیدت و ستائش کا ہدیہ پیش کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

گرچہ بحر او ندارد احتیاج
می رسد از جوئے ما او را خراج

اور اس کا فن، حسن و کمال کا معیار بن جاتا ہے۔

چون رباید از بساط روزگار
ہر نگار از دست او گیرد عیار

ایسے ہی با کمال و آزاد فنکار کی فنی تخلیقات فطرت کے بے مثال شاہکار ''حور جنت،، سے بھی زیادہ حسین و دلکش ہوتی ہیں ۔ جن کا منکر مسلک جمالیات میں کافر کہلاتا ہے۔

حور او از حور جنت خوشتراست
منکر لات و مناتش کافراست

وہ نہ صرف ہمارے لئے ایک نئے جہان کی تخلیق کرتا ہے، بلکہ ہمارے قلب کو ایک نئی زندگی بھی عطا کرتا ہے۔

آفریند کائنات دیگرے
قلب رابخشد حیات دیگرے

اس کا ہر فن پارہ جانفزا بھی ہوتا ہے اور گوہر نایاب بھی۔

بحر و موج خویش را بر خود زند
پیش ماہو جش گہر می افگند

ایسے عظیم فنکار میں زندگی کی اتنی بہتات ہوتی ہے ۔ کہ وہ اسکی بدولت ہر تن مردہ کو قوت حیات سے معمور کر دیتا ہے۔

زان فراوانی کہ اندر جان اوست
ہر تہی را پر نمودن شان اوست

ایسے فنکار کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ کہ وہ خوب و زشت کا معیار ہوتا ہے۔ اقبال اس امر کی مزید توضیح یہ کرتا ہے۔ کہ ایسے فنکار کی حسین فطرت، حسن و قبح کا موضوعی اور اس کا فن اس کا معروضی معیار ہوتا ہے۔

فطرت پاکش عیار خوب و زشت
صنعتش آئینہ دار خوب و زشت

اور یہی فنکار ہے جو فطرت پر اپنی عظمت و فضیلت کو ''حقیقت برھنہ،، کے طور پر اس طرح بیان کرتا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال اس لئے فنکار کو یہ وصیت کرتا ہے۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ھوسکا وہ تو کر

غلامی خواہ فطرت کی ہو یا دنیا کی، اقبال کے نزدیک وہ فن کی انتہائی پستی اور ذلت کی دلیل ہے۔ کیونکہ غلامی روح کے لئے ایک مرگ مسلسل ہے۔ یہ جوانی کے جوش و خروش کو بڑھاپے کے جمود و تعطل سے بدل دیتی ہے۔ یہ حرکت و ارتقاء کی حریف ہے۔ یہ ہیئت اجتماعی میں برھمی و انتشار پیدا کر دیتی ہے۔ اور افراد کے جسموں کو بغض و عناد کے زہر سے اس قدر بھر دیتی ہے۔ کہ اس کی اذیتوں میں مبتلا رھنا ان کی قسمت کا لکھا بن جاتا ہے۔

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بار تن
از غلامی ضعف پیری در شباب — از غلامی شیر غاب افگندہ ناب
از غلامی بزم ملت فرد فرد — ایں و آں بااین و آں اندر نبرد

غلامی کے بھیانک اور انسانیت سوز اثرات کے پیش نظر اقبال فن کی آزادی پر زور دیتا ہے، اور اس فن کو جو غلام و محکوم ھو، نوع انسانی کے لئے ھلاکت و نامرادی کی وجہ حقیقی خیال کرتا ہے۔ لہذا فن کو محکومی و غلامی سے بچانے

کی خاطر، اس کے ہولناک نتائج کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ زبور عجم کے آخر میں "در بیان فنون لطیفۂ غلامان،، کے عنوان کے تحت، وہ موسیقی پر غلامی کے اثرات کی تصریح اس طرح کرتا ہے۔

مرگ ہا اندر فنون بندگی　　من چہ گویم از فسون بندگی
نغمۂ او خالی از نار حیات　　ہم چو سیل افتد بدیوار حیات
چون دل او تیرہ سیمائے غلام　　پست چون طبعش نواہائے غلام
از دل افسردۂ او سوز رفت　　ذوق فردا لذت امروز رفت
از نئے او آشکارا راز او　　مرگ یک شہر است اندر ساز او
ناتوان و زار می سازد ترا　　از جہان بیزار می سازد ترا

لہذا ایسے فن سے پرہیز و گریز ہی میں سلامتی ہے۔

الحذر این نغمۂ مرگ است و بس
نیستی در کسوت صوت است و بس

ایسے فن سے جمالیاتی حس کی تسکین نہیں ہوا کرتی، کیونکہ وہ اس جوہر سے تہی دامن ہوتا ہے۔ جو جمالیاتی حس کی تشفی کا حقیقی سامان ہے۔

تشنہ کامی! ایں حرم بے زمزم است
در بم و زیرش ہلاک آدم است

یہی نہیں بلکہ

سوز دل از دل برد غم می دہد
زہر اندر ساغر جم می دہد

صورت کے اعتبار سے فن کتنا ہی بے عیب کیوں نہ ہو، لیکن ما فیہ کے لحاظ سے اگر بے عیب نہیں ہے۔تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اقبال کے نزدیک غلامی کا اثر صورت سے زیادہ ما فیہ پر پڑتا ہے۔ بہر حال جس طرح موسیقی غلامی میں روح کے لئے پیام موت ہے۔ اسی طرح مصوری بھی محکومی میں اپنے جانفزا اثرات سے محروم ہو کر انسان کے لئے ہلاکت و بربادی کی لقیب بن جاتی ہے۔

می چکد از خامہ ہا مضمون موت
ہر کجا افسانہ و افسون موت

نفسیاتی طور پر بھی دیکھا جائے تو غلامی ایک نہایت خطرناک چیز ہے ۔ یہ روح کی چور ہے ۔ جو قلب انسانی سے اس کی دولت ایقان کو چرا لیتی ہے ۔ اور اس کی جگہ اس میں بے یقینی پیدا کر دیتی ہے ۔ جو فن کے لئے از بس مضرت رساں ہے۔ کیوں کہ اس سے یہی نہیں کہ قلب ذوق تحقیق اور قوت تخلیق سے محروم ہو جاتا ہے ۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ندرت فکر،جدت تخیل اور جودت طبع سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ نتیجتاً وہ کوئی تازہ اور نئی تخلیق کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

بے یقیں را لذت تحقیق نیست　　بے یقیں را قوت تخلیق نیست
بے یقیں را رعشہ ھا اندردل است　　نقش نو آوردن او را مشکل است

اس بے یقینی سے فنکار فقط اپنے آپ سے دور ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے خود اعتمادی بھی جاتی رہتی ہے ۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فنکار جو اصل میں ذوق جمال کے سلسلے میں عوام کا رہنما ہے ۔ خود ان کے ذوق کا مقلد و محکوم بن جاتا ہے ۔ اور اس طرح رنج و ملال میں مبتلا رہنا اسکا مقدر ہو جاتا ہے۔

از خودی دور است و رنجور است و بس
رھبر او ذوق جمہور است و بس

در غلامی تن ز جان گردد تہی　　از تن بے جان چہ امید بہی
ذوق ایجاد و نمود از دل رود　　آدمی از خویشتن غافل رود

عشق کو اقبال کے نظام فکر میں از بس اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک عشق ہی تخلیقی فعلیت کا اصل محرک ہے ۔ یہاں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے ۔ کہ اقبال کا تصور عشق کیا ہے؟ جیسا کہ ہم پہلے معلوم کر چکے ہیں ۔ اقبال، خودی کو حسن مطلق ہی کا ایک جزو تصور کرتا ہے۔ یہ جزو جو اپنی ذات کے شعور کے سبب انفرادیت کا احساس رکھتا ہے ۔ اپنی اصل کے وصال کی ایک فطری طلب و جستجو بھی رکھتا ہے ۔ اقبال کی شاعری میں عشق سے عبارت بھی طلب و جستجو ہے۔

اور اقبال کے تصورات عشق و فن کا خلاصہ یہ ہے ۔ کہ سوز عشق، یا خون جگر، فن کے لئے ناگزیر ہے، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی فنی تخلیق درجہ٘ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

نقش ہیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال کے فلسفہ میں حیات انسانی کا اپنے لا محدود ممکنات کو بروئے کار لاتے ہوئے، عالم الوہیت کی طرف جو حسن و سرور کا عالم بیکراں ہے ، مسلسل بڑھتے رہنا ہی اس کی اصل عبادت ہے ۔ یہی اس کا حقیقی مدعا و مقصد، یہی اس کی تقدیر، اور یہی مشیت ایزدی بھی ہے ۔ لہذا جو شئے حیات انسانی کے اس وظیفہ کی ادائیگی میں ممدو معاون ہو، وہ اقبال کی قرآنی اصطلاح میں ''حلال،، اور جو حریف و مزاحم ہو وہ ''حرام،، ہے۔ یہی مسلک اس کا فن کے بارے میں بھی ہے۔ اور اس بناء پر وہ غائیت یا مقصدیت کو فن کا ایک ناگزیر اساسی عنصر سمجھتا ہے۔ اور جمالیات میں مفتئی فن کی حیثیت سے یہ فتویٰ دیتا ہے ۔ کہ جو فن اپنے اس اساسی عنصر کا حامل ہے ۔ وہ جمالیاتی شریعت میں ''حلال،، اور جو نہ ہو وہ ''حرام،، ہے۔

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل — نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا — جسکی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جسکی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک — اور پیدا ہو ایازی سے مقام محمود
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے — تو رہے اور تیرا زمزمۂ لا موجود
جسکو مشروع سمجھتے ہیں فقیہان خودی — منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

خودی، عشق کی گرمی یا سوز ہی کی بدولت عالم ممکنات کو منکشف و مسخر کرتی ہوئی مقام الوہیت کی طرف مسلسل بڑھتی رہتی ہے ۔ لہذا یہ سوز ابدی ہی جو حیات انسانی کے اس ارتقائے سرمدی کے لئے ناگزیر ہے، فن کا حقیقی مقصود ہے۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

یہ شعر اس حقیقت کی طرف بھی نشاندھی کرتا ہے ۔ کہ فن کا کمال اس کی ابدیت و آفاقیت میں، اور اسکا زوال اس کی عارضیت و محدودیت میں مضمر ہوتا ہے۔

فن چونکہ اقبال کے نزدیک حسن و کمال کا مجسمہ ہوتا ہے، اس لئے وہ اسے آفاقی اور لازمی طور پر سرور انگیز دیکھنا چاہتا ہے، اور اس لئے اس فن کو جو شادمانی کی بجائے افسردگی پیدا کرنے والا ہو، فن ہی نہیں سمجھتا ۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا؟
ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دلاویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرخودی تیز
افسردہ اگر اسکی نوا سے ہو گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

سوز عشق، پیغمبری (یعنی معراج انسانیت) کا اور شقاوت، فرعونیت (یعنی زوال انسانیت) کا خاصہ ہے۔ اور عالم انسانی کو فرعونیت سے پاک و صاف کرنے کے لئے جس شئے کی ضرورت ہوتی ہے، اسے اقبال تلمیحاً ''ضرب کلیمی،، ''صوراسرافیل،، اور ''بانگ درا،، کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس کو فن کی فطری صلاحیت خیال کرتا ہے۔ جس کے بغیر فن اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

حیات انسانی کی ابدیت کی ضامن جس طرح ضرب کلیمی یا صور اسرافیل ہے۔ اسی طرح نغمۂ جبریل بھی ہے۔ یہ ایک جلالی قوت ہے۔ دوسری جمالی، لیکن یہ دونوں ھی حسن کے صفات ہونے کی بنا پر قومی زندگی پر ایک جیسا جانفزا و حیات پرور اثر پیدا کرتی ہیں۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن — یہ نکتہ ہے تاریخ امم جسکی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے — یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

اقبال کے افکار و تصورات کا اصل سر چشمہ تصور خودی ہے۔ لہذا وہ بار بار خودی کی حفاظت و تعمیر کو نہ صرف فن کا بلکہ دین و سیاست اور علم ، ادب سبھی کا مقصود حقیقی سمجھتا ہے۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یکدانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کرسکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر — وائے صورت گری شاعری و نائے و سرود

تعمیر خودی یا آدم گری کوئی معمولی نوعیت کا کام نہیں ۔ یہ تو مقصود فطرت اور پیغمبری کا اہم وظیفہ ہے۔ لہذا جو فنکار تعمیر خودی کا کام کرتا ہے۔ وہ فطرت کے منشاء کو پورا کرنے اور پیغمبری کے کام میں حصہ لینے کے باعث وارث پیغمبری ہوتا ہے۔